

صنعتی سرمائے اور عمارات پر زکوٰۃ

مولانا محمد طاہرین

ہمارے ہاں کے بعض علماء کا فتویٰ ہے کہ صنعتوں میں لگے ہوئے مشینیں] سرمائے اور اسی طرح کرائے پر اٹھائی جانے والی عمارتوں میں لگے ہوئے سرمائے پر تجارتی سرمائے کی طرح زکوٰۃ فرض نہیں۔ پچھلے دنوں قاہرہ میں مجمع البحوث الاسلامیہ کی دوسری کانفرنس ہوئی ہے، جس میں چالیس ممالک کے ایک سو سے زائد علماء اور شیوخ نے شرکت فرمائی۔ کانفرنس کی صدارت شیخ الازہر شیخ مامون نے فرمائی۔ کانفرنس نے متعدد قراردادیں با اتفاق رائے پاس کیں، جن میں قرارداد نمبر ۴ یہ ہے :-

”مکانات، کارخانہ جات، مشینوں، بحری اور ہوائی جہازوں وغیرہ پر زکوٰۃ فرض نہیں۔“

اس مضمون میں اس مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ (مدیر)

صنعت کاری اور کارخانہ داری کا جو نظام تاریخ کے صنعتی دور کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور جو آج دولت کمانے کا ایک نہایت موثر اور کامیاب ذریعہ ہے، عہد رسالت اور عہد صحابہ میں موجود نہ تھا۔ اسی طرح وہ بعد کے ان زمانوں میں بھی موجود نہ تھا، جب کہ فقہ اسلامی کی تدوین عمل میں آئی اور اس نے اپنے ارتقاء کے مختلف مراحل اور مدارج طے کئے، لہذا قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں جزوی صراحت کے ساتھ کوئی ایسا حکم نہیں ملتا جس سے صنعتی سرمائے پر زکوٰۃ عائد ہونے نہ ہونے کا علم ہو سکتا ہو، اسے طرح آج یہ جو لاکھوں کے سرمائے سے اہم مقامات پر عالی شان بلڈنگیں بنانے اور ان کو بڑے بڑے

کریوں پر چلانے کا جو نہایت منفعت بخش معاشی کاروبار ہے اپنی موجودہ شکل میں وہ پہلے کبھی موجود نہ تھا۔ عہد رسالت میں تو سرے سے اس قسم کی عمارتیں بنانے کی اجازت ہی نہ تھی چہ جائیکہ ان کو کرانے پر چلانے کا کاروبار ہوتا، بعد کے زمانوں میں البتہ اس کا کچھ نشان ملتا ہے لیکن اس کی نوعیت باقاعدہ کاروباری نہ تھی جیسی کہ آج ہے، اتفاق سے کسی کو کوئی زائد مکان مل جاتا مثلاً وراثت وغیرہ کی راہ سے اس کے پاس آ جاتا تو وہ اسے کرانے پر اٹھا دیتا اور اس کی آمدنی سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا، مطلب یہ کہ اپنی فاضل دولت کو بڑھانے کی غرض سے یہ کاروبار نہ تھا، لہذا اس کی موجودہ شکل کے متعلق فقہ اسلامی میں کوئی جزوی اور صریح حکم نہیں ملتا، جس سے اس قسم کی جائداد میں لگے ہوئے سرمائے کے متعلق معلوم ہو سکے کہ اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے یا نہیں، البتہ فقہ اسلامی میں ایسے اصولی تصورات ضرور ملتے ہیں جن سے اس قسم کے نئے نئے جزوی مسائل کے لئے جزوی احکام مستنبط اور اخذ کئے جاسکتے ہیں، لہذا ہم ذیل میں اسی قسم کے کچھ اصولی تصورات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کتب فقہ میں لکھا ہے کہ کسی مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مال حوائجِ اصلیہ سے فاضل اور نامی ہو، یعنی ایک غنی مسلمان کے ہر اس مال پر زکوٰۃ واجب ہے جو اس کے حوائجِ اصلیہ سے زائد اور نامی ہو۔ یہ ایک اصولی تصور ہے۔ لیکن اس کا صحیح مطلب اس وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب لفظ حوائجِ اصلیہ اور لفظ نامی کا اصطلاحی مفہوم و مطلب واضح طور پر سامنے ہو، لہذا ان دونوں لفظوں کا فقہی مفہوم و مطلب واضح کیا جاتا ہے۔

حوائجِ اصلیہ فقہاء نے حوائجِ اصلیہ کی تعریف جن الفاظ میں کی ہے، وہ یہ ہیں:

هِيَ الَّتِي مَا يَكْدُفَعُ الْهَلَاكُ وَعَنِ الْإِنْسَانِ تَحْقِيقًا أَوْ تَقْدِيرًا. حَوَائِجُ اَصْلِيَّةٌ وَهِيَ حَيْثُ يَجَانِبُ الْهَلَاكُ مِنْ مَخَالَطَةِ الْبَاسِ وَالْوَشَاكِ، رَهَائِشِي مَكَانٍ أَوْ رَاسِ كَافِرِيحِجْرٍ، اسْتِعْمَالِي اسْلِحَةٍ، سَوَارِي كَاجَانُودِ خِدْمَتِ كَعَلَامٍ، عِلْمَاءِ كَالْكَتَابِيْنَ اَوْرَابَابِ هَمَزٍ وَبِشِي كَعِدَّةِ اَوْرَاكٍ اَوْرَاكَاتِ جَنِّ كَسَاخِدِهٖ وَهَ كَامِ كَرْتِي اَوْرُوذِي كَمَاتِي هِي، تَقْدِيرًا كِي تَوْصِيحِ مِي لَكَا هِي كَسِ اَسِ مَرَادِهٖ رَمْتِي هِي، جَوْ قَرْنُوْنِ كِي اِدَائِيحِ كَلِي لِي مَحْفُوْظِ هُوْنِ كِيُوْنِ كَهٗ اِنْسَانِ كُوْقِيْدِ وَبِنْدِ سِي بِيَاْتِي هِي جُو اِيكِ طَرِحِ كِي هَلَاكَتِي هِي.

فقہ حنفی کی مختلف کتابوں میں حوائجِ اصلیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اسے ہم اپنے لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ فقہاء کے نزدیک حوائجِ اصلیہ میں ایک تو وہ چیزیں داخل ہیں جو براہِ راست

ذاتی استعمال میں آتی ہیں۔ عام ہے کہ وہ ضرورت کے درجہ کی ہوں یا آسائش اور زیب و زینت کے درجہ کی ، دوسری وہ چیزیں داخل ہیں جو پہلی قسم کی چیزوں کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہوں یعنی وہ معاشی ذرائع اور وسائل جن پر ذاتی استعمال کی چیزوں کے حاصل ہونے کا دار و مدار ہو۔ عام ہے کہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا مکان کی شکل میں، جانوروں کی شکل میں ہوں یا مشینوں وغیرہ کی شکل میں۔ مثلاً ایک کاشت کار کا وہ رقبہ زمین جس میں وہ کاشت کرتا نیز وہ آلات و اوزار جن کے ساتھ وہ کاشت کاری کے مختلف کام سرانجام دیتا ہے حواجِ اصلیہ میں داخل ہیں جیسے ہل بیل وغیرہ اور موجودہ مشینی دور میں ٹریکٹر وغیرہ۔ لیکن ایک زرعی فارم کا سرمایہ حواجِ اصلیہ میں داخل نہیں جسے کسی سرمایہ دار نے ایک وسیع رقبہ زمین میں لاکھوں کے خرچہ کے ساتھ قائم کیا ہو اور زرعی ماہرین اور مزدوروں کی مدد سے وہ اس کو چلاتا ہو اور اس سے اس کا اصل مقصد اپنے فاضل سرمائے کو بڑھانا اور اپنی تونگری اور دولت مندی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا ہو۔

اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس مثلاً اس کے رہائشی مکان کے علاوہ اتفاق سے کوئی اور مکان ہے اور وہ اسے کرائے پر دے کر اس کی آمدنی سے گزر بسر کرتا ہے یعنی اس سے اس کا مقصود اپنے فاضل مال میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ ذاتی استعمال کی چیزیں حاصل کرنا ہے تو ایسا مکان حواجِ اصلیہ میں داخل ہے، لیکن ایک ایسا مکان جسے کوئی غنی سرمایہ دار اس غرض سے تعمیر کرتا ہے، اور کرائے پر چلاتا ہے کہ اس کی فاضل دولت میں مزید اضافہ ہو تو وہ حواجِ اصلیہ کے تحت نہیں آتا۔

علیٰ ہذا اقیاس پیشہ وروں اور کاری گروں کے آلات و اوزار اور مشینیں جن کے ساتھ وہ کام کر کے روزی کمانے اور سامانِ زیست حاصل کرتے ہیں، خواہ وہ کتنی ہی قیمت کے کیوں نہ ہوں، حواجِ اصلیہ میں داخل ہیں اور ان میں لگے ہوئے سرمائے پر زکوٰۃ نہیں، مثلاً ایک شخص کے پاس ایک ٹرک یا بس یا لالچ کشتی ہے اور وہ اسے خود چلاتا اور اس کی آمدنی پر گزارا کرتا ہے تو وہ بلاشبہ حواجِ اصلیہ میں داخل ہے، لیکن وہ آلات اور مشینیں حواجِ اصلیہ میں کسی طرح داخل نہیں جن سے غرض اور مقصود اپنی فاضل دولت کو بڑھانا اور غنا اور تمول میں اضافہ کرنا ہوتا ہے نہ کہ ذاتی استعمال کے لئے سامانِ معاش حاصل کرنا، گو یا اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ جو چیزیں براہ راست انسان کے ذاتی استعمال میں آتی ہوں اور جو چیزیں ذاتی استعمال کی چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہوں حواجِ اصلیہ میں داخل ہیں، اور ان پر زکوٰۃ نہیں۔

نامی حواجِ اصلیہ کے اصطلاحی معنی اور فقہی مفہوم کی توضیح و تشریح کے بعد آپ لفظ نامی کو لیجئے، نامی کا

مصدر النماء ہے جس کے لغوی معنی زیادتی اور بڑھوتری کے ہیں۔ حیوانات اور نباتات کے اجزائے اہلیہ میں جو بڑھوتری ہوتی ہے اسی کا نام النماء اور النمو ہے، لہذا حقیقی معنی کر کے نامی صرف حیوانات اور نباتات ہیں، لیکن فقہا باب الزکاة میں جب کسی مال کو نامی کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد اس کا لغوی اور حقیقی معنی اہنیں ہوتا بلکہ ایک خاص اصطلاحی معنی مراد ہوتا ہے۔ اس بارے میں ہم فقہ حنفی کی نہایت مستند اور مشہور کتاب بدائع الصنائع کی عبارت ذیل میں نقل کرتے ہیں، جو انھوں نے زکاة کی شرائط کے سلسلہ میں تحریر فرمائی ہے :-

منہا كون المال نامياً لان	کسی مال پر زکوة واجب ہونے کے لئے جن شرائط کا پایا
معنى الزکوة وهو النماء لا يحصل	جانا ضروری ہے ان میں سے ایک یہ کہ وہ مال نامی ہو کیونکہ
الامن المال النامى ولنا لنعنى به	زکوة کے معنی دراصل تمام کے ہیں اور وہ حاصل نہیں ہوتے
حقیقة النماء لان ذلك غير	مگر نامی مال سے، اور نامی سے ہماری مراد اس کے حقیقی معنی
معتبر وانما لنعنى به كون المال	نہیں کیونکہ ان کا اعتبار نہیں، نامی سے ہماری مراد صرف یہ ہے
معداً للاستتماء بالتجارة او بالاسامة	کہ مال کا تیار شدہ ہونا بڑھوتری کے لئے، تجارت کے ذریعے یا
لان الاسامة سبب لحصول	اسامتہ (چرائی) کے ذریعے، کیونکہ اسامتہ، مولیشیوں سے
الدر والنسل والسمن والتجارة	دودھ، نسل اور فرہی حاصل ہونے کا سبب ہے اور تجارت
سبب لحصول النسخ في مقام	حصول منافع کا سبب، پس سبب کو مسبب یعنی نماء کے
السبب مقام المسبب وتعلق	تاقم مقام کر کے حکم کو اس سے متعلق کر دیا گیا ہے یعنی زکوة
الحکمر به - ج ۲ ص ۱۱	کے وجوب کو مجازاً اسامتہ اور تجارت سے وابستہ کر دیا گیا ہے

مذکورہ عبارت میں دو باتیں خاص طور پر قابل لحاظ اور قابل توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ نامی سے مراد اس کے حقیقی معنی نہیں بلکہ اصطلاحی معنی ہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ فقہاء ان تمام اموال کو نامی کہتے ہیں جن پر زکوة واجب ہوتی ہے حالانکہ ان میں کئی اموال ایسے ہیں جن میں کبھی بھی حقیقی نام نہیں پائی جاتی، مثلاً جمادات اور نباتات سے حاصل شدہ مختلف جناس اور اشیاء جو تجارت کے لئے ہوں ان کو اور ہر حال میں سونے چاندی کو نامی کہا جاتا ہے حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ان میں کبھی بھی حقیقی نشوونما واقعہ نہیں ہوتی لہذا ان کو نامی کہنا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جب نامی سے مراد اس کے حقیقی معنی نہ ہوں بلکہ ایسے اصطلاحی معنی ہوں جو اموال زکوة کی تمام قسموں پر صادق آسکتے ہوں چنانچہ انھوں نے نامی کی جو اصطلاحی تعریف کی ہے، وہ سب پر صادق آتی ہے۔ اس تعریف کا مطلب

ہم اپنے لفظوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جس مال کو کسی ایسے معاشی طریقے سے متعلق کر دیا گیا ہو جس طریقے سے عام طور پر مال میں زیادتی واقع ہوتی اور مالک کو نفع پہنچتا ہے وہ مال نامی ہے۔ نامی کی اصطلاحی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مال کے نامی ہونے میں اس کی ذات کو دخل نہیں بلکہ انسانی ارادے اور عمل کو دخل ہے جس چیز کو انسان نامی بنانا چاہے اپنے ارادے اور عمل سے بنا سکتا ہے مثلاً جس چیز کو وہ تجارت کے لئے مخصوص کر لے وہ نامی بن جاتی ہے۔ گویا فقہی اصطلاح میں نامی ہونا کسی چیز کی اپنی صفت نہیں بلکہ ایک عارضی صفت ہے۔

دوسری بات جو اس عبارت میں قابل غور اور توجہ ہے وہ یہ کہ حقیقتہً زکوٰۃ کا تعلق اُس نمو اور بڑھوتری سے ہے، جو مویشیوں میں بصورت دودھ گھی، نسل اور فرجہی اور تجارتی اموال میں بصورت منافع ظاہر ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ نمو اور بڑھوتری اسامہ اور تجارت کے سبب سے وجود میں آتی ہے لہذا مجازاً زکوٰۃ کا تعلق اسامہ اور تجارت سے جوڑ دیا گیا ہے گویا یہ کہا گیا ہے کہ کسی مال پر زکوٰۃ عائد ہونے کا اصل سبب جو شارع کی نظر میں ہے وہ اس مال میں زیادتی کا رونما ہونا ہے نہ کہ وہ اسامہ اور تجارت جو اس زیادتی کا موجب ہے۔ اس سے یہ گنجائش پیدا ہو گئی ہے کہ اگر مال میں زیادتی، اسامہ اور تجارت کے علاوہ کسی اور کاروباری طریقے سے واقع ہو جاتی ہے یعنی مثلاً کاروبار کا کوئی ایسا طریقہ ایجاد ہو جاتا ہے جس کے ذریعے اسامہ اور تجارت کی طرح مال میں زیادتی اور بڑھوتری وجود میں آتی ہے تو اس پر بھی زکوٰۃ ضرور واجب ہوگی کیونکہ اس بارے میں اصل چیز نمو اور بڑھوتری ہے نہ کہ اس کے حصول کا کوئی خاص طریقہ۔

چنانچہ نامی کی اصطلاحی تعریف کی رُو سے ہر وہ مال نامی قرار پاتا ہے جسے کسی ایسے معاشی طریقے سے متعلق اور مخصوص کر دیا گیا ہو جس سے عام طور پر مال میں زیادتی ہوتی اور مالک کو نمایاں نفع پہنچتا ہے، سائِمہ جانور اس لئے نامی کہلاتے ہیں کہ وہ اسامہ کے جس معاشی طریقے سے وابستہ ہوتے ہیں، اس سے عام طور پر ان میں نمو اور زیادتی ہوتی ہے اور مالک کو کھلے طور پر نفع پہنچتا ہے۔ اسی طرح تجارتی اموال اس وجہ سے نامی میں شمار ہوتے ہیں کہ وہ تجارت کے جس کاروباری طریقے سے متعلق ہوتے ہیں اس سے عام طور پر سرمائے میں اضافہ ہوتا اور مالک کو نفع پہنچتا ہے۔ علوفہ جانور نامی کی تعریف میں نہیں آتے اس لئے کہ ان کو تھان پر گھاس چارہ کھلا کر پالا جاتا اور ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے لہذا ان کے وجود سے مالک کو کوئی نفع نہیں پہنچتا مالک ان سے جو فائدہ اٹھاتا ہے اس کے عوض وہ ان کی خوراک وغیرہ پر خرچہ کرتا اور ان کی دیکھ بھال میں مشقت اٹھاتا ہے لہذا بلحاظ نتیجہ اس کو ان سے کوئی خاص نفع نہیں پہنچتا اور ان پر لگی ہوئی دولت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات اس میں کمی

واقعہ ہوجاتی ہے، اسی طرح جو اشیاء تجارت کے لئے نہیں ہوتیں نامی کے تحت نہیں آتیں کیونکہ ان میں جو مال لگا ہوا ہوتا ہے اس میں نہ صرف یہ کہ کچھ زیادتی نہیں ہوتی بلکہ الٹی کمی ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے اگر وہ ذاتی استعمال میں آ رہی ہوتی ہیں تو استعمال کی وجہ سے روز بروز ان کی قیمت گھٹتی جاتی ہے اور اگر یونہی بے کار پڑی ہوئی ہیں تو اس صورت میں بھی مسلسل بے کار پڑے رہنے اور پرانے ہوتے رہنے کی وجہ سے ان کی مالیت گرتی ہے پڑھتی نہیں۔

لفظ نامی کے اصطلاحی اور فقہی معنی کی اتنی وضاحت اس وجہ سے بھی کرنی پڑی کہ مجھے اندازہ ہوا کہ بعض اچھے خاصے علماء کرام تک کے ذہن میں بھی واضح نہیں اور غلطی اور عدم توجہی سے وہ اس کا لغوی معنی لے لیتے ہیں۔

اموال تجارت اور زکوٰۃ

ہایہ وغیرہ میں ہے، الزکوٰۃ واجبة فی عروض التجارة کائنہ ما کانت اذ بلغت قیمتھا نصیباً من الورق والذهب۔ سامان تجارت پر زکوٰۃ واجب کی خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو۔ جب اس کی قیمت چاندی یا سونے کے نصاب تک پہنچ جائے، ذرا واضح الفاظ میں مطلب یہ کہ جو اشیاء تجارت کی غرض سے ہوں عام ہے کہ وہ زمین و مکان کی شکل میں ہوں یا جانوروں اور اجناس خوردنی کی شکل میں، جمادات اور مختلف دھاتوں کی شکل میں ہوں یا خشک نباتات اور ان سے بنے ہوئے مختلف ساز و سامان کی شکل میں، جب ان کی مالیت سونے چاندی کے نصاب کے برابر ہو جائے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور سال گزرنے پر ادا کرنی پڑتی ہے۔ دراصل یہ بھی زکوٰۃ کے باب میں ایک اصولی تصور ہے لیکن اس کا بھی صحیح مفہوم و مطلب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ لفظ تجارت کا مفہوم و معنی اصاف طور پر سامنے نہ ہو۔

باب زکوٰۃ میں تجارت کا معنی | مذکورہ عبارت میں عروض تجارت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کا صحیح معنی و مفہوم جب تک واضح طور پر معلوم نہ ہو بصیرت کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ کون سی چیزیں عروض تجارت میں آتی ہیں اور کون سی نہیں آتیں۔ لہذا ذیل میں اس لفظ کی تشریح پیش کی جاتی ہے۔

مختلف کتابوں میں لفظ تجارت کے مفہوم و مطلب کے متعلق جو مختلف عبارتی ملتی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ التجارة تقليب المال لغرض الربح (تاج العروس) منافع کی غرض سے مال میں الٹ پھیر کرنا

تجارت ہے۔

۲۔ التجارة التصرف فی رأس المال طلباً للربح (مفردات راعب) منافع کی خاطر سرمائے میں

تصرف اور رد و بدل کرنا تجارت ہے۔

۳۔ التجارة هي التصرف في المال للمرجح (کشاف اصطلاحات الفنون) تجارت نام ہے نفع کے لئے مال میں تصرف کرنے کا۔

۴۔ التجارة عقد اکساب المال (مبسوط السرخسی) تجارت اس معاملے کا نام ہے جو مال کمانے کے لئے ہو۔ یہ معنی قاضی ابویوسف کی طرف منسوب ہے۔

۵۔ عقد التجارة هو كسب المال بالمال بعقد شراء او اجارة او استقراض (در المختار) عقد تجارت نام ہے مال کے بدلے مال کمانے کا وہ خرید و فروخت کے ذریعے ہو یا اجارے کے ذریعے یا قرض لینے کے ذریعے۔

۶۔ التجارة هي مبادلة مال بمال (کشاف اصطلاحات) تجارت کا مطلب ہے مال کا تبادلہ مال سے کرنا۔

۷۔ التجارة كسب المال ببدل هو مال (بدائع الصنائع) مال کے بدلے میں مال کمانے کا نام تجارت ہے۔

۸۔ التجارة شراء شئ بالمرح (دستور العلماء) کسی چیز کو خریدنا تاکہ نفع کے ساتھ فروخت کی جائے تجارت

تجارت کی یہ جو چند تعریض نقل کی گئی ہیں ان کے مفہوم و مطلب میں عموم و خصوص کا اختلاف تو ضرور ہے لیکن ان کے مابین کوئی تباہن اور تضاد بالکل نہیں، یعنی ایسا نہیں کہ بعض کو صحیح ماننے سے دوسرے بعض کا غلط ہونا لازم آتا ہو اور ان سے ایک دوسرے کی نفی ہوتی ہو، پہلی، دوسری اور تیسری تعریف کا محصل ایک ہے، یعنی منافع کی خاطر سولے میں تصرف اور رد و بدل کرنا۔ بعد کی تعریفوں کے مقابلہ میں یہ عام ہے یہ معاشی کاروبار کے ان تمام طریقوں پر صادق آتی ہے جن میں سرمایہ نگار منافع حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح چوتھی تعریف کا مطلب بھی عام ہے اس کی رو سے اکساب مال کا ہر معاملہ تجارت ہے خواہ وہ مال کے بدلے میں ہو جیسا کہ بیع و شرا میں ہوتا ہے یا مال کے بدلے میں نہ ہو جیسا کہ ہبہ، وصیت اور مہر وغیرہ میں ہوتا ہے۔ تجارت کا یہ چوتھا معنی قاضی ابویوسف کی طرف منسوب ہے یا پتھواں معنی پہلے چار معنوں کی بہ نسبت کچھ خاص اور محدود ہے لیکن بعد والے معنوں کی بہ نسبت اس میں بھی قدرے عموم ہے کیونکہ یہ صرف بیع و شرا تک محدود نہیں جیسا کہ بعد والے معنے ہیں بلکہ یہ اجارہ اور استقراض کو بھی شامل ہے۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں تعریفوں کا مطلب ایک ہے۔ یعنی بیع و شرا، کیوں کہ کتب فقہ میں بیع کی جو تعریف ہے وہ بعینہ یہی ہے جو ان عبارتوں میں تجارت کی ہے یعنی مال کا مال سے تبادلہ۔

عزور و فکر سے کام لیا جائے تو بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ تجارت کا اصل مفہوم تو وہ ہے جو پہلی تین عبارتوں میں بیان ہوا ہے۔ لیکن عملی طور پر اس کی متعدد اور مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں جن میں سے بعض شکلیں وہ ہیں جو

بعد کی تعریفوں میں بیان ہوئی ہیں گویا بعد کی تعریفیں تجارت کی نہیں بلکہ تجارت کی بعض عملی شکلوں کی تعریفیں ہیں جو کثیر الوقوع اور عرفی طور پر زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ بہر حال بیع اور تجارت کا بعینہ ایک مفہوم نہیں بلکہ بیع خاص اور تجارت عام ہے۔ یعنی ہر بیع تو تجارت ہے لیکن ہر تجارت بیع نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں بیع کو تجارت پر عطف کیا گیا ہے جو ان کے درمیان مغائرت کی دلیل ہے۔ **فَمَا يَأْتِي جَالَهُمْ تَجَارَةً وَلَا بَيْعٌ عَنِ ذِكْرِ اللَّهِ**۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو نہ تجارت ذکر اللہ سے غافل کرتی ہے اور نہ بیع۔ چونکہ معطوف اور معطوف علیہ میں ضرور مغائرت ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی معمولی درجہ کی کیوں نہ ہو۔ لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تجارت اور بیع دونوں بعینہ ایک چیز نہیں بلکہ ان کے مابین عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔ تفسیر قرطبی میں آیت **أَلَا تَكُونُ تَجَارَةً** عن تراویح منکر کی تفسیر میں جہاں تجارت کے معنی بیع و شراء کے لکھے ہیں وہ یہ بھی لکھا ہے کہ **كُلُّ مُعَاوَضَةٍ تَجَارَةٌ عَلَىٰ آتِي وَجْهِهِ كَانَ الْعَوَضُ** ہر معاوضہ تجارت ہے وہ کسی وجہ سے بھی ہو۔

یہاں پر اصل سوال یہ ہے کہ کتب فقہ کے ابواب الزکاة میں جو لفظ تجارت استعمال ہوا ہے اس کا معنی و مفہوم کیا ہے۔ کیا اس کا فقہاء کے نزدیک کوئی خاص اصطلاحی معنی و مفہوم ہے یا وہی معنی و مفہوم ہے، جو علمائے لغت نے لکھا ہے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ عزائے خیر دے صاحب کشف اصطلاحات الفنون کو کہ انہوں نے نہایت واضح اور مرتب الفاظ میں اس کا جواب دے دیا ہے فرمایا ہے۔ **وفی کتاب الزکاة: التجارة** ہی التصرف فی المال للربح (ترجمہ) کتاب الزکاة میں تجارت کے معنی ہیں منافع کی خاطر مال میں تصرف کرنا۔ مبسوط الرشیدی کتاب الزکاة میں بھی تین جگہ ایسی عبارتیں ملتی ہیں جن سے تجارت کا یہی معنی سمجھ میں آتا ہے جو صاحب کشف نے لکھا ہے۔ رہا یہ سوال کہ بعض فقہانے اپنی کتابوں میں تجارت کے معنی مبادلتہ مال بال مال کے کیوں کئے ہیں تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ انہوں نے دراصل تجارت کی اس خاص شکل کی تعریف کی ہے جو مشہور و معروف اور کثیر الاستعمال ہے حتیٰ کہ تجارت کا لفظ سنتے ہی ذہن اسی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر یہی تعریف انہوں نے کتاب البیوع میں لفظ بیع کی بھی کی ہے۔

تجارت کا مفہوم و معنی متعین ہونے کے بعد مذکورہ بالا اصولی تصور کا مطلب یہ ہوا کہ زکوة ہر اس مال اور سرمے پر واجب ہے جو منافع کی غرض سے تصرف میں لایا گیا ہو۔

نیت تجارت | فقہانے لکھا ہے کہ جہاں تک سونے چاندی کا تعلق ہے وہ چونکہ اپنی اصل خلقت کے لحاظ سے

تجارت کے لئے متعین ہیں لہذا ان کے مال تجارت ہونے کے لئے نیت تجارت کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان کے علاوہ جو باقی چیزیں ہیں چونکہ ان میں یہ احتمال بھی ہوتا ہے کہ ذاتی استعمال کے لئے ہوں اور یہ احتمال بھی ہوتا ہے کہ تجارت کے لئے ہوں۔ لہذا ان کے مال تجارت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے متعلق صراحتاً یا دلالتاً تجارت کی نیت اور تجارت کا عمل بھی ہو۔ اس سلسلہ میں بدائع الصنائع کی ایک عبارت کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عبارت جلد دوم میں صفحہ گیارہ پر ہے۔

”سونے اور چاندی کا تجارت کے لئے تیار ہونا اپنی اصل خلقت کے لحاظ سے ثابت ہے۔ کیونکہ اپنی ذات کے لحاظ سے وہ صلاحیت ہی نہیں رکھتے کہ حوائج اعلیٰ کو دور کرنے میں ان سے انتفاع کیا جائے پس انسان کی طرف سے نیت کے ساتھ ان کو تجارت کے لئے تیار کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ نیت تعیین کے لئے ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی بناوٹ و ساخت کے لحاظ سے تجارت کے لئے متعین ہیں۔ لہذا نیت کے ذریعے تعیین کی حاجت نہیں پس ان پر زکوٰۃ ہر حال میں واجب ہے تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو۔ البتہ ان کے سوا جو دوسری چیزیں ہیں ان کو تجارت کے زمرہ میں لانے کے لئے تجارت کی نیت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ جس طرح تجارت کے لئے صلاحیت رکھتی ہیں اسی طرح ذاتی استعمال میں آنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہیں بلکہ ان سے اصل مقصود یہی ذاتی استعمال ہے لہذا تجارت کی تعیین انہیں ضروری ہے اور یہ تعیین نیت سے ہوگی اور تنہا نیت کا اعتبار نہیں، جب تک کہ اس کے ساتھ فعل تجارت نہ ہو۔“

غور سے دیکھا جائے تو اس عبارت میں ایک اصولی ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جو چیزیں اپنی بناوٹ و ساخت کے لحاظ سے ایسی ہوں کہ ذاتی استعمال کے لئے ہونے کا ان میں احتمال ہی موجود نہ ہو بلکہ وہ تجارتی کلامبار ہی کے لئے متعین ہوں، ان کو مال تجارت کے زمرہ میں لانے کے لئے نیت کی ضرورت نہیں۔ اور جو چیزیں اپنی بناوٹ و ساخت کے لحاظ سے ایسی ہوں جن میں ذاتی استعمال کے لئے ہونے کا بھی احتمال موجود ہو اور تجارت کے لئے ہونے کا بھی احتمال پایا جاتا ہو تو ان کو مال تجارت کے لئے متعین کرنے میں نیت تجارت ضروری ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فعل تجارت بھی ضروری ہے۔

مثلاً ایک شخص کے پاس کپڑے سینے کی ایک مشین ہے تو اس کے متعلق یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ذاتی استعمال کے لئے ہو اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تجارت کے لئے ہو۔ لہذا تجارت کے لئے وہ اس وقت ہوگی جب مالک

تجارت کا ارادہ اور عمل کرے۔ لیکن اس کے برخلاف کسی شخص کے پاس ایک فیکٹری یا مل کی مشینری ہے تو اس میں ظاہر ہے کہ ذاتی استعمال کے لئے ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہذا وہ مذکورہ بالا اصولی ضابطہ کی رو سے تجارت کے لئے متعین ہوگی۔

علیٰ ہذا القیاس کسی شخص کے پاس ایک ایسا مکان ہے جو ایک خاندان کی رہائش کے لئے ہو سکتا ہے تو اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ذاتی ضرورت اور استعمال کے لئے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تجارت کے لئے ہو۔ لیکن ایک دس منزلہ عمارت جس میں سینکڑوں فلیٹ اور کمرے ہوں اس کے متعلق ذاتی استعمال ہونے کا کوئی احتمال پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ بغیر کسی اظہار کے تجارت کے لئے متعین ہے۔

سامان تجارت کے نقل و حمل کے جانور فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جو سرمایہ تجارت کے لئے متعین ہو جیسے مثلاً مضاربت پر دیا ہو اس سرمایہ۔ تو اس سے جو کچھ بھی خریداجائے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ انہوں نے مثال کے طور پر لکھا ہے کہ مضاربت پر کام کرنے والا مال مضاربت سے کچھ تو سامان تجارت خریدتا ہے اور کچھ اس مال سے نقل و حمل کے جانور خریدتا ہے تو سال گزرنے پر ان دونوں پر زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ امام محمد شیبانی کی مشہور کتاب الجامع الکبیر کی عبارت ملاحظہ فرمائیے :

رجل دفع رجل مالا مضاربة	ایک شخص نے دوسرے کو مضاربت پر کام کرنے کے لئے مال دیا
فان شترى ببعضه طعاماً ومنا	اس نے اس مال کے کچھ حصے سے غلہ خریدا اور کچھ حصے سے اس غلہ
بقی منه حمولة للطعام ولا ينوی	کے حمل و نقل کے لئے جانور خریدا اور اس نے کوئی نیت نہیں کی۔
شيثاً او اشترى ببعضه رقيقاً و	یا اس نے کچھ مال سے غلام خریدے اور کچھ مال سے ان کے کھانے
بما بقى طعاماً لهم وكسوة فحال الحول	پینے کا سامان اور پہننے کے کپڑے۔ سال گزرنے کے بعد مال
فعلى مربي المال زكاة دأس ماله و	والے پر اصل سرمائے اور اپنے حصہ کے منافع دونوں کی
حصته من الربح۔ الجامع الکبیر ص ۲۱	زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

اس مذکورہ عبارت سے آگے جو یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی مالک اپنے کچھ مال سے بغرض تجارت غلہ خریدے اور کچھ مال سے نقل و حمل کا جانور خریدے تو اس جانور پر زکوٰۃ نہ ہوگی تو اس کی وجہ دوسرے فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ چونکہ اس جانور کے متعلق یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تجارت کے مال سے خریدا گیا ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تجارت کے لئے نہ خریدا گیا ہو بلکہ غیر تجارتی مال سے ذاتی استعمال کے لئے خریدا گیا ہو۔ لہذا تا وقتیکہ کسی دلیل سے ثابت نہ ہو جائے

کہ وہ تجارت کے لئے خرید گیا ہے۔ اس پر زکوٰۃ نہ ہوگی۔ مطلب یہ کہ اگر وہ یقیناً تجارت کے لئے ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ ضرور ہوگی۔ بدائع الصنائع کی عبارت ملاحظہ کیجئے:

المالك اذا اشتري عبداً للتجارة مالک نے تجارت کے لئے غلام خریدے پھر ان کے پہننے کے کپڑے
ثم اشتري لهم ثياباً للكسوة وطعاماً اور کھانے کے لئے سامان خورد و نوش خریدیا تو یہ کپڑے اور
للنفقة فانه لا يكون للتجارة لان سامان تجارت کے لئے نہ ہوں گے کیونکہ مالک کو جس طرح
المالك كما يملك الشراء للتجارة تجارت کے لئے خریدنے کا اختیار ہے اسی طرح اسے خرچہ
يملك الشراء للنفقة والبدلته وان اور استعمال کے لئے بھی خریدنے کا اختیار ہے اور اسے حق
ينفق من مال التجارة وغير مال التجارة پہنچتا ہے کہ مال تجارت میں سے خرچ کرے یا غیر مال
فلا يتعين للتجارة الا بدليل تجارت سے خرچ کرے پس وہ تجارت کے لئے متعین نہ
نرايئد - ج ۲ - ص ۱۳ ہوں گے مگر کسی دلیل سے۔

اس کا صاف مطلب ہے کہ اگر دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ جانور وغیرہ مال تجارت سے خرید گیا ہے تو اس پر زکوٰۃ ہوگی۔ یہ دراصل ایک اصولی ضابطہ ہے جس کی رو سے بغیر کسی استثناء کے ان تمام چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہے جو تجارت کے مال اور سرمائے سے خریدی گئی ہوں، وہ اجناس اور خام مواد کی شکل میں ہوں یا ان جانوروں ٹرکوں اور مشینوں کی شکل میں جن سے تجارت کے سلسلے میں کام لیا جاتا ہو۔

یہاں تک یہ جو چند اصولی تصورات کتب فقہ سے پیش کئے گئے ہیں اب ان کی روشنی میں زیر بحث مسئلہ پر گہری نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ صنعت کاری اور کارخانے کے سرمائے اور کرائے کی خاص بلڈنگوں کے سرمائے پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے یا نہیں، آپ دیکھیں گے کہ حوائجِ اصلیہ سے متعلق جو اصولی تصور پیش کیا گیا ہے اس کی رو سے یہ دونوں سرمائے حوائجِ اصلیہ کے تحت نہیں آتے، کیونکہ یہ نہ تو ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں اور نہ ذاتی استعمال کی چیزوں کو حاصل کرنے کا ذریعہ، کیونکہ ان سے غرض اور مقصود اپنی دولت کو بڑھانا اور اپنی توانگری اور دولت مندی میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ نامی کے متعلق جو اصولی تصور پیش کیا گیا ہے اس کے مطابق یہ دونوں سرمائے نامی کا مصداق ہیں۔ کیونکہ ان کو زیادتی اور بڑھوتری کے لئے ایسے طریقے سے تیار کیا جاتا ہے جو ان میں زیادتی اور بڑھوتری کا باعث بنتا ہے۔ نیز تجارت کے معنی و مفہوم کی بابت جو اصولی تصور پیش کیا گیا ہے اس کی رو سے یہ دونوں سرمائے، اموال تجارت کے زمرہ میں آجاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں بھی منج اور نفع کی خاطر تصرف اور لوٹ

پھیر ہوتا ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کسی مال کے مال تجارت ہونے کے لئے نیت تجارت کا جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے اس کے مطابق کارخانوں کی مشینری اور کرائے کی خاص طرح کی جائیداد بغیر نیت کے مال تجارت میں آجاتی ہے۔ کیونکہ ذاتی استعمال کے لئے ہونے کا ان میں سرے سے احتمال ہی نہیں۔ نیز اس قاعدے کی رو سے کہ مال تجارت سے جو سامان بھی خریداجائے اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ کارخانوں کی مشینیں اور کرائے کی خاص بلڈنگیں مال زکوٰۃ میں آجاتی ہیں۔ جب حقیقت حال یہ ہے یعنی یہ کہ یہ دونوں سرمائے حوائجِ اعلیٰ سے زائد اور مال تجارت ہونے کی وجہ سے نامی ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان پر زکوٰۃ عائد نہ ہو، جس طرح کہ اس قسم کے دوسرے اموال پر عائد ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں آجکل جو بڑے بڑے کارخانے مشترک سرمائے سے لگائے اور چلائے جاتے ہیں جن میں مثلاً پچاس فیصد سرمایہ ایک شخص یا خاندان کا ہوتا ہے جس کے نام سے وہ کارخانہ موسوم اور مشہور ہوتا ہے اور پچاس فیصد دوسرے بہت سے لوگوں کا حصص کی صورت میں ہوتا ہے اور منافع سرمائے کے تناسب سے ان سب کے درمیان تقسیم ہوتا ہے، علماء حضرات ایسے حصص کو خریدنا اور ان پر منافع لینا جائز بتلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ مضاربت ہے جو اسلام میں جائز ہے۔ ان کے اس فتوے کی رو سے ایسے کارخانے کا تمام مال بعد مشینوں کے مال تجارت قرار پاتا اور اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ہم نے امام محمد کی کتاب الجامع الکبیر کی عبارت نقل کی ہے اس میں صاف لکھا ہے کہ اگر مضارب، مال مضاربت کے کچھ حصہ سے غلہ وغیرہ خریدتا ہے اور کچھ حصہ سے عمل و نقل کے لئے جانور، تو سال گزرنے کے بعد اس سارے سرمائے پر زکوٰۃ ہوگی۔ لہذا اس اصل کے مطابق کارخانہ دار اپنے حصہ داروں کے مال سے جو کچھ بھی خریدتا ہے، وہ خام مواد ہو یا مشینیں وغیرہ ہوں، وہ سب مال تجارت ہے اور سب پر زکوٰۃ واجب ہے۔

اس کے ساتھ عقل و قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب تجارت میں لگے ہوئے تمام سرمائے پر اسی طرح ساکنہ موتیوں پر ہر سال اصل اور منافع دونوں پر زکوٰۃ ہے تو کارخانہ داری کے کاروبار میں لگے ہوئے سرمائے پر بھی ہر سال اصل اور منافع دونوں پر زکوٰۃ ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ دونوں اپنی اصل ماہیت، روح اور غرض و غایت کے لحاظ سے ایک ہیں اور ان میں کوئی جوہری اور اساسی فرق نہیں۔ اگر تجارتی سرمائے میں اصل اور منافع دونوں پر ہر سال زکوٰۃ کا واجب ہونا ظلم نہیں بلکہ عین عدل ہے تو پھر کارخانہ داری کے سرمائے میں اصل اور منافع دونوں پر ہر سال زکوٰۃ کا واجب ہونا کیوں ظلم ہے۔ ہر ذی عقل اور سمجھ دار آدمی

اس پر سوچ کر فیصلہ کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ عقل سلیم اور فہم مستقیم رکھتا ہو۔

آخر میں مختصر طور پر ان دلائل کا ذکر دینا فائدے اور دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جو فیکریٹریوں اور کارخانوں کے مشینی سرمائے کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرنے کے ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں۔ ایک تو وہی حدیث ہے جس کے متعلق ہم گزشتہ مضمون میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں کہ اس کے مضمون کا زیر بحث مسئلہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس حدیث کے نام پر زیر بحث سرمائے کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرنا صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم پر بھوٹ و افترا کی باندھنا ہے العیاذ باللہ! دوسری دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ یہ سرمایہ غیر نامی ہے اور اس میں کچھ بڑھوتری اور زیادتی واقعہ نہیں ہوتی بلکہ مشینیں گھسنے سے ان کی مجموعی مالیت میں کمی واقعہ ہوتی ہے۔ لہذا اس پر زکوٰۃ نہیں ہونی چاہیے۔ اس دلیل سے ایک یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے پیش کرنے والے کے ذہن میں نامی کا لغوی مفہوم ہے فقہی اور اصطلاحی مفہوم نہیں ورنہ ایسی بات نہ کہتا، دوسرا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو کچھ پتہ نہیں کہ مالک کا حضانہ سالانہ منافع سے مشینوں کی گھسانی کا عوض وصول کرتا ہے۔ وہ ایک درزی کی طرح اپنی مشین کی گھسانی کا خسارہ خود برداشت نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں ہر سال اس کے اصل سرمائے میں نمایاں بڑھوتری اور زیادتی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ چند سال بعد ایک دوسرا کارخانہ قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب دلیل یہ پیش فرمائی گئی ہے کہ آج کل جو کارخانے قائم کئے جاتے ہیں وہ بنکوں کے قرضوں سے قائم کئے جاتے ہیں اور ان کی پیداوار اور منافع سب بنکوں میں چلا جاتا ہے اور کسی وقت بھی مالکان کے پاس مصنوعات اور منافع کا ذخیرہ موجود نہیں رہتا۔ لہذا کارخانوں کی مشینوں وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں ہونی چاہیے۔ اس دلیل کے متعلق یہ عرض کروں گا کہ یہ کارخانوں اور بنکوں کے کاروبار سے بلا تعلقیت پر مبنی ہے ان کو اتنا معلوم نہیں کہ کوئی بنک ہر شخص کو کارخانہ لگانے کے لئے قرضہ نہیں دیتا بلکہ ایسے شخص کو مثلاً پانچ لاکھ قرضہ دیتا ہے جو پندرہ لاکھ اپنا ملا کر بیس لاکھ کا کارخانہ قائم کرتا ہے اور پھر یہ مالک کارخانہ اس سے اتنا کماتا ہے کہ چند سال میں نہ صرف یہ کہ سب قرضہ ادا کر دیتا ہے بلکہ ایک دوسرا کارخانہ قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کیا یہ واقعہ نہیں کہ پاکستان بننے پر جن لوگوں نے ایک کارخانہ لگایا تھا وہ آج کئی کئی کارخانوں کے مالک ہیں اور لاکھوں پتی سے کروڑوں پتی بن چکے ہیں اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ کچھ ایسے کارخانے دار بھی ہیں، جن مسکینوں کی حالت نازاں آپ نے نہایت عمدہ انداز سے بیان کی ہے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اصولاً کارخانوں کے سرمائے پر زکوٰۃ

ہونی ہی نہیں چاہیے۔ مثلاً اگر کچھ تاجر بینکوں کے قرضہ کے بل بوتہ پر تجارتی کاروبار کرتے ہیں اور ان کے منافع کا بڑا حصہ بطور سود بینکوں کے پاس پہنچ جاتا ہے تو کیا اس سے یہ لازم آئے گا کہ اصلاً کسی تجارتی سرمائے پر زکوٰۃ نہ ہو۔ زکوٰۃ میں قرضہ کے احکام کی بالکل انگ بخت ہے، جو تفصیل کے ساتھ فقہاء نے لکھی ہے۔

اس سلسلے میں جو ایک نہایت غلط بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ اگر کارخانوں کے مشینی سرمائے پر اور ان کے منافع پر زکوٰۃ لگائی جائے تو دوسری زکوٰۃ ہوگی۔ جس سے نہ صرف یہ کہ مالکان کا رخا نہ پر ظلم ہوگا بلکہ چند سال میں اصل سرمائے کا بھی استیصال ہو جائے گا اور کارخانے ناپید ہو جائیں۔ اس بات کے کہنے والے سے کوئی یہ پوچھے کہ یہ جو چودہ سو سال سے تجارت کے اصل سرمائے اور اس سے حاصل شدہ منافع دونوں پر زکوٰۃ رہی ہے اسی طرح ساٹھ جانوروں پر ہر سال اصل اور ان سے پیدا شدہ زوائد دونوں پر زکوٰۃ عائد رہی ہے۔ کیا یہ دوسری زکوٰۃ نہ تھی۔ اور کیا دوسری ہونے کی وجہ سے آپ اس کو بھی ظلم کہیں گے اور کیا اس سے مسلمانوں کے ہاں سے تجارتی سرمائے اور تجارت کا استیصال ہو گیا اگر نہیں ہوا بلکہ اس کے باوجود وہ بڑھتا اور ترقی کرتا رہا تو دوسری زکوٰۃ سے صنعتی سرمائے اور صنعتوں کا استیصال کیسے ہو جائے گا اگر اس کے منافع کو کم از کم بیس فی صد ہی رکھا جائے تو اس میں سے ڈھائی فی صد نکلنے سے کیا کمی واقعہ ہو جائے گی۔ اس کو ظلم سے تعبیر کرنا سخت گمراہی کی بات ہے۔ اگر دوسرا کوئی ایسی بات کرے تو آپ کھر کھرتوئی لگانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ خدا کے لئے جو بات کریں اپنے داعی توازن کو درست رکھتے ہوئے کریں ورنہ آپ کے اس رویے سے دین کو کچھ فائدہ پہنچنے کی بجائے الٹا نقصان پہنچے گا۔ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا کے مصداق بنیں گے اور وکایجر منکم شتان قوم علی ان کا تعدلوا کی قرآنی تعلیم کو سامنے رکھیں اور دشمن کی بھی جو صحیح بات ہو اسے ماننے میں پس و پیش نہ کریں۔ ورنہ آپ کی بھی صحیح بات کو کوئی سہنیں مانے گا۔

